رجسٹر نمبر ایل ۹۲۲
ٹیلیفون نمبر ۲۹

تار کا پتہ
انجمن علی گڑھ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کا پندرہ روزہ اخبار

قیمت فی پرچہ دو آنے — سالانہ چندہ دو روپے

جلد ۱۲ | ۱۵ اگست ۱۹۵۴ء | ایڈیٹر: قاضی عبدالغفار | ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ | نمبر ۴۰

اردو کی نصابی کتابیں اور اردو ٹیچر

مرکزی انجمن کا دفتر بار بار حکومت کے ارباب کار کو توجہ دلاتا رہا ہے کہ اردو کی نصابی کتابیں بازار سے بالکل غائب ہو گئی ہیں اور یہ ذمہ داری محکمۂ تعلیم کی ہے کہ وہ ان کی فراہمی کا معقول انتظام کرے۔

دستخطوں کی مہم اور صدر جمہوریہ کی خدمت میں انجمن کی یادداشت پیش کرنے کے بعد اتنا تو ہوا کہ اتر پردیش کی حکومت نے ابتدائی مدارس میں ایسے طلبا کے داخلے کے متعلق جن کی مادری زبان اردو ہے کچھ احکام جاری کر دیے اور ایک اسپیشل افسر بھی مقرر کر دیا گیا لیکن عملی طور پر ہنوز ان احکام کی تعمیل نہیں ہو رہی ہے اور ہمارے پاس جو شکایتیں آ رہی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائی مدارس میں ابھی تک اردو کی تعلیم کا کافی انتظام نہیں ہو سکتا۔ ہم اسپیشل افسر صاحب اور محکمۂ تعلیم کو بار بار توجہ دلا رہے ہیں کہ یہ مشکل ابھی پوری طرح حل نہیں ہوئی۔ اور مزید یہ کہ جہاں جہاں اردو کی تعلیم کا کچھ انتظام کیا گیا وہاں نصابی کتابیں میسر نہیں آئیں۔ حکومت نے نصابی کتابوں کی اشاعت کے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں اور ان اختیارات کے تحت ہندی کی کتابوں کی فراہمی کا تو پورا انتظام ہے لیکن اردو کی کتابیں نایاب ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا حکومت یا اس کے ماتحت افسران ایک ہاتھ سے دیکر دوسرے ہاتھ سے واپس لے رہے ہیں۔ یہ بھی اعلان کیا جاتا ہے کہ اردو کی تعلیم کا انتظام کر دیا گیا اور پھر اس تعلیم کے لئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے یعنی کتابیں ان کا کوئی انتظام نہیں۔ اس طرح جمع اور تفریق کا عمل برابر سرابر ہو جاتا ہے!

حکومت کو بار بار توجہ دلانے کے بعد اب ڈائرکٹر تعلیمات کا ایک پریس نوٹ اخباروں میں شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ :-

بیسک اسکولوں کا نیا نصاب اور نئی کتابوں کے آرڈر جولائی ۱۹۵۳ء میں پاس کر دیے گئے تھے اور نئی بیسک ریڈروں کے ہندی ایڈیشن اس وقت بازاروں میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

لیکن ترجمے کی مجبوری اور مقیّد چھپائی کی وجہ سے اردو کتابیں اب تک بازار میں نہیں آ سکی ہیں گو کہ امید کی جاتی ہے کہ یہ کتابیں بھی جلد بہم دستیاب ہو سکیں گی لیکن اردو پڑھنے والوں بچوں کو دقت سے بچانے کے لئے عام اطلاع کے لئے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ بیسک نصابی کتابوں کے ۱۹۵۳ء کے اردو ایڈیشن ریاست کے پرائمری اسکولوں میں اس سال بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں اور جو کمی رہ جائے گی وہ نئی کتابوں کے بازار میں چھپ کر آ جانے کے بعد پوری ہو جائے گی۔

پریس نوٹ میں آگے چل کر کہا گیا ہے کہ ایسے اسکولوں میں جہاں اردو پڑھنے والے بچوں کی تعلیم کا انتظام ہے وہاں اردو کتابوں کے سلسلے میں یکسانیت برتنے کے لئے خاص توجہ کی جانی چاہئے۔ اس سے اردو کتابوں کے ناشرین کی دقت بھی رفع ہو جائے گی۔

ہم نہیں سمجھ سکے کہ طباعت کی ایسی کیا دشواریاں ہو سکتی ہیں جن کی وجہ سے اردو کتابیں ابھی تک بازار میں نہ آ سکیں۔ بہر حال غنیمت ہے کہ ۱۹۵۳ء کی کتابوں کو اس سال بھی استعمال کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے لیکن وہ بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ کتابوں کے طبع کرنے والے اتنی ہی کتابیں چھاپتے ہیں جتنی کہ ایک سال میں فروخت

ہو جاتی ہیں۔ ان کے پاس زبان کا مسئلہ محفوظ نہیں رہتا اس لئے ہمیں اندیشہ ہے کہ ستائیس کی تعداد میں بھی کافی تعداد میں بیاہ تبدیل ہو سکتی ہے۔ بہرحال اب جبکہ حکومت نے اس دسواری کو رفع کر دینے کا ارادہ کر لیا ہے تو دیکھ اٹھنا کے [illegible] ضروری رعایت کی جائے [illegible] کوششیں [illegible] اور سب سے [illegible] [illegible] اس کے وقت [illegible] تعلیم [illegible] ہو رہا ہے۔ [illegible] اساتذہ کی تعداد [illegible] [illegible] اس کی [illegible] [illegible] شروع ہو گئی ہے تو [illegible] کی کوششیں کرے گی اور یہ [illegible] اردو کے متعلق [illegible] [illegible] بہت مشکل ہو گا۔

[illegible] میں کوئی مفروضہ انجمن ترقی اردو

لکھنؤ کے ایک [illegible] صاحب کا مراسلہ شائع ہوا ہے [illegible] قاضی انور احمد صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو بریلی [illegible] قاضی انور احمد صاحب سے اگر ہم واقف نہ ہوتے تو ہم کو [illegible] [illegible] لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ مرکزی انجمن کے صدر دفتر کو [illegible] بریلی میں انجمن کی کوئی شاخ موجود ہے یا یہ کوئی [illegible] [illegible] کام کرنے والے لوگ [illegible] کام کیا کرتے ہیں [illegible] ضرورت کے وقت کسی بھی جلسے ادارے کے نام کو اپنے ساتھ چسپاں کر لینا آسان کام ہے۔ لیکن [illegible] کا کیا جواز ہے [illegible] تو قاضی انور احمد صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔

ہم نے بریلی میں انجمن کی شاخ قائم کرنے کی ایک دو مرتبہ کوشش کی لیکن بعض وجوہ [illegible] کی طرح یہاں بھی [illegible] ہماری کوششوں کو [illegible] کر دیا۔ اب اگر کوئی جماعت مرکزی دفتر کی ہدایات کے بغیر [illegible] انجمن کا نام [illegible] بریلی میں [illegible] خدمت کرنے کے لئے [illegible] ہو گئی ہے تو ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ بشرطیکہ قاضی انور احمد صاحب یا کوئی صاحب یہ بتا سکیں کہ وہ کیا کام کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ حالت بریلی کے علاوہ بعض دوسرے اضلاع میں بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہاں [illegible] اور شکایتیں تو بہت [illegible] بہت کوششیں ہوتی ہیں۔ لیکن خود ان صاحب سے جو شکایتیں کرتے ہیں اگر سوال کیجئے کہ :

تو بچوں نے [illegible]

آپ نے اپنے شہر یا ضلع میں کیا کام کیا تو اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ حال ہی میں ایک اخبار نے مرکزی انجمن کو ہدف ملامت بنانے کی کوشش فرمائی ہے لیکن اگر اس کے مدیر سے سوال کیا جائے کہ خود جناب نے اپنے شہر میں اردو کے لئے کیا کام کیا ہے تو اس سوال کے جواب کا ہم دلچسپی کے ساتھ انتظار کریں گے۔

بے شک بستی یا اعظم گڑھ جیسے اضلاع کہ جہاں ٹھوس عملی کام ہو رہا ہے ایسا حق پہنچتا ہے۔ [illegible] کہ انھوں نے اپنے عمل سے دوسری شاخوں کے لئے ایک [illegible] مثال قائم کی ہے۔ لیکن اگر کوئی بے عمل دوسروں کے [illegible] اردو کی [illegible] بلکہ [illegible] اور اپنے "[illegible]" کی حالت پر افسوس بھی ہوتا ہے۔

اردو زبان اور دیوناگری رسم خط

(از۔ رسول احمد صاحب)

جناب محمد اسحاق صدیقی نے "ہماری زبان" مورخہ [illegible] جون کی اشاعت میں میری بعض غلطیوں اور [illegible] کا ذکر کرتے ہوئے میرے دونوں مضامین کا جواب دیا ہے اور پھر اردو زبان کے لئے دیوناگری رسم خط کی تائید کی ہے۔ ان کے نزدیک نہ صرف دیوناگری رسم خط اردو کے لئے موزوں ہی ہے بلکہ اردو کا تحفظ، ہندی اردو جھگڑے کا حل اور ہندوستانی کے ارتقا کے لئے بھی ضروری ہے۔

اردو زبان کے لئے دیوناگری رسم خط کی موزونیت کا ثبوت ان کے نزدیک وہ تجربہ ہے جو دیوان غالب، اور استاد ذوق جیسے [illegible] کی کتابوں کے دیوناگری رسم خط میں شائع ہونے سے حاصل ہوا ہے اور ظاہر ہے اس طرح کے تجربات سے نتیجہ دیوناگری رسم خط کی تائید میں نکلتا ہے یا اس طرح کا امکان معلوم ہوتا ہو تو ایسی مثالوں کا کیا، اثر باقی رہ سکتا ہے جو دیوناگری رسم خط کی تردید میں دی گئی ہوں۔ لہٰذا میں نے اس قسم کی جو مثالیں اردو الفاظ کو دیوناگری رسم خط میں تحریر کیا اور ان کا تلفظ اردو رسم خط میں لکھ کر دی تھیں۔ اور اس طرح یہ ثابت کیا تھا کہ اگر اردو زبان کی ہیئت ترکیبی اور اس کی قومی حیثیت کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو یقیناً اردو زبان کو ختم کر دیتی ہے اور اس طرح اردو زبان کے لئے دیوناگری رسم خط اختیار کرنے کا کوئی بجائے اپسند طبیعت فیصلہ کر بھی لے تو بھی دیوناگری رسم خط اپنی جگہ اردو زبان کے لئے ہرگز موزوں رسم خط نہیں ہے۔

اس سلسلے میں دی گئی ان ۲۳ مثالوں میں سے جناب صدیقی صاحب نے دو مثالوں کا ذکر کیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انھوں نے ۲۳ مثالوں میں سے محض دو کا ہی ذکر کیوں کیا ہے اور نہ میں یہ صورت حال کے مطابق یہ سمجھتا ہوں کہ ان کو دوسری مثالوں میں غلطیاں نہ ملیں۔ بہرحال انھوں نے دو مثالوں کا انتخاب کیا یعنی شاعر اور رہبر کا جن کو میں نے دیوناگری رسم خط میں لکھ کر تلفظ شایر اور رہیر، لکھا تھا۔ ہندی جاننے والے لوگوں سے پڑھوایا اور میری غلطیاں

معلوم کریں۔

ظاہر ہے کہ جب ہندی جاننے والوں نے برخلاف میرے [illegible] شاعر کو شاہو اور [illegible] زہیر کو رہبر پڑھ دیا تو غلطی معلوم ہونے میں باقی کیا رہ گیا۔ مگر کیا مجھے صدیقی صاحب کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ دیوناگری رسم خط میں "ع" کے تلفظ کے لئے کوئی حرف ہے ہی نہیں، رہ گیا رہبر کا معاملہ، اس کا فیصلہ اگر تجربے کی بنیاد پر کرنا منظور ہو تو کسی ایسے خطے میں چلے جایئے جہاں دیوناگری رسم خط کا رواج تو ہو مگر اردو الفاظ سے کان آشنا نہ ہوں پھر آپ شاعر اور رہبر ہی کیا صدہا ایسے الفاظ کا دیوناگری رسم خط میں لکھوا کر ان کا تلفظ سن لیجئے۔ آپ کو دیوناگری رسم خط کی قوت کا پتہ چل جائے گا۔

اس لئے دیوناگری میں لکھے [illegible]، شاہر اور [illegible] زہیر کو اگر ہندی جاننے والے نے بقول صدیقی صاحب ... شاہو اور رہبر پڑھ دیا ہے تو اس کا سبب محض یہ ہے کہ اردو الفاظ سے لوگوں کے کان آشنا نہیں ہیں نہ یہ کہ دیوناگری رسم خط اردو زبان کے لئے موزوں ہے یہی بات ان اردو کتابوں کے لئے بھی ہے۔ جو دیوناگری رسم خط میں شائع ہو گئی ہیں اور شائع ہونے والی ہیں۔ اور یہ صورت حال اس بات کو واضح کرتی ہے کہ اگر اردو زبان کو صحت لفظی کے ساتھ محفوظ رکھنا ہے۔ جیسے آپ نے بھی عربی فارسی الفاظ کے تلفظ کے لئے گیارہ گیارہ نشانات وضع کرنے کی بات کہہ کر تسلیم کر لیا ہے۔ تو اردو رسم خط کو اپنی جگہ قائم رکھنا ضروری ہے اور تب اس کے ساتھ ہی ایک حد تک اردو زبان کے لئے دیوناگری رسم خط کا استعمال بھی کوئی معنی رکھے گا۔

اس طرح ایک طرف تو اردو لکھنے والوں کی ادق زبان لکھنے کی عادت چھوٹے گی اور دوسری طرف ہندی والے اردو ادب کی خوبیوں سے واقف ہوں گے۔ اور پھر ہو سکتا ہے کہ رفتہ رفتہ ذہنیتوں میں بھی تغیر پیدا ہو جائے اور خواہ مخواہ کسی رسم خط یا زبان کو دیوار نہ سمجھا جائے اور تبھی اس بات کا بھی امکان ہے کہ اردو اور ہندی دونوں زبانیں بھی اعتدال پر آجائیں۔ حالانکہ صدیقی صاحب اس اعتدال کے لئے تنہا دیوناگری رسم خط کو ضروری سمجھتے ہیں جب کہ ظاہر ہے کہ ایک رسم خط کی وجہ سے زبان یا تو سنسکرت کی طرف چلی جائے گی یا عربی یا فارسی کی طرف۔

اس سلسلے میں صدیقی صاحب کا یہ خیال کہ "اگر اردو زبان کے لئے دیوناگری رسم خط اختیار کر لیا جائے تو آج ہندی میں جو سنسکرت کے الفاظ بھرتی کئے جا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اردو کے سبک اور شیریں الفاظ کے مقابلے میں سنسکرت کے ثقیل اور کرخت الفاظ بھی مقبول نہ ہوں گے۔ زبان شاعروں اور ادیبوں کی ملکیت نہیں ہے اس پر عوام کا بھی حق ہے۔ اور عوام انہیں الفاظ کو اپنائیں گے جن کا تلفظ آسان ہو اور جن میں رس اور مٹھاس ہو۔"

میں نہیں سمجھتا کہ صدیقی صاحب کا یہ یقین آج کے حالات میں کس تجربے کا نتیجہ ہے جبکہ ہندی زبان سے آپ ایسے معمولی اردو الفاظ بھی خارج کئے جا رہے ہیں جو پچھلے ۲۰، ۲۰۰، ۵۰۰ سالوں سے رائج تھے اور ان کی جگہ سنسکرت کے ثقیل اور کرخت الفاظ بھرتی کئے جا رہے ہیں۔

ایسی حالت میں برخلاف صدیقی صاحب کے خیالات کے ایسا کیوں ممکن نہیں ہے کہ اردو والوں کے اردو رسم خط ترک کر دینے اور دیوناگری رسم خط اختیار کر لینے پر ہندی والوں کے وہ احیائی رجحانات اسی طرح قائم رہیں جو ہندوستان کی سرزمین پر مسلم اثرات کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کوئی ایسی کوشش کریں جس سے یہ گیارہ گیارہ نشانات والا نیا اور ناپسندیدہ دیوناگری رسم خط اور اس کے ساتھ ہی وہ اردو زبان جو اس نئے ناپسندیدہ رسم خط میں لکھی جا رہی ہو ختم ہو جائے اور شدھ دیوناگری لپی اور شدھ ہندی یعنی دیوبانی رہ جائے۔ رہی سنسکرت کے ثقیل اور کرخت الفاظ کی اور اردو کے سبک اور شیریں الفاظ کی بات تو جو الفاظ صدیقی صاحب کے نزدیک ثقیل اور کرخت ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ وہ ان لوگوں کے لئے بھی ثقیل اور کرخت ہوں جن کا تعلق سنسکرت کے ساتھ جذباتی قسم کا ہے اور جو اپنے ان جذبات کا اظہار گاہے گاہے سنسکرت کو بھارت کی راجیہ بھاشا بنانے کی حد تک کر جاتے ہیں۔ رہا عوام کا سوال سو اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ عوام کے جذبات کتنی جلدی دھرم اور مذہب کے نام پر ابھارے جا سکتے ہیں اور کیا کچھ اس سے نہیں کرایا جا سکتا۔ اس کے لئے کم از کم ہندوستان میں تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی باتیں صدیقی صاحب کے نزدیک اس قسم کے اندیشے ہوں جس کے ساتھ انہیں پاکستان کا ذکر کرنا بھی ضروری ہو۔

میں نہیں سمجھتا کہ ایسے موقعوں پر پاکستان کے بننے نہ بننے کا ذکر کیوں کیا جاتا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ "مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم ہندوؤں کے ساتھ مل کر رہیں گے تو ہندو ہمیں کھا جائیں گے اس لئے انھوں نے الگ رہنے کی ٹھانی اور پاکستان بنا لیا۔" گویا پاکستان کی تشکیل میں اکثریت کی اس تنگ نظری اور خلاف مسلم رجحانات کا جو تحریک آزادی تک میں نمایاں تھے اور آج سیکولر اسٹیٹ میں بھی نمایاں ہیں۔ کوئی دخل نہ تھا۔ اور اگر بفرض محال "خوف دو عالم" مسلمانوں کی گردن پہ ان بھی لیا جائے تو صدیقی صاحب کا یہ کہنا کہاں تک اس کے ساتھ مطابقت کرتا ہے کہ "اب اردو زبان کو اردو رسم خط میں لکھ کر وہ ہندی والوں سے الگ رہنا چاہتے ہیں اور اس کا انجام بھی ظاہر ہے یعنی اردو کا دائرہ دن بدن محدود ہو کر ختم ہو جائے گا۔" گویا اردو والوں کا رسم خط اردو نہ تھا وہ تو محض ہندی والوں سے الگ رہنے کے لئے اردو رسم خط میں لکھنے لگ گئے ہیں جس کا نتیجہ ان کی اس حرکت کی وجہ سے یہ ہو گا کہ اردو کا دائرہ دن بدن محدود ہو کر ختم ہو جائے گا۔

مجھے اعتراف ہے کہ اردو کا دائرہ دن بدن محدود ہو رہا ہے مگر اس کی وجہ [illegible] رسم خط نہیں ہے۔ جو [illegible] صدیقی صاحب [illegible] دیکھتے ہیں بلکہ حکومت [illegible] اکثریت کی وہ متعصب ذہنیت ہے جو مسلمان قوم کے [illegible] جو ہندوستان میں [illegible] سمجھا جا رہا ہے [illegible] خواہ اردو زبان ہو، خواہ مسلمان قوم [illegible] اور اس کا ظاہر ہے کہ آپ اس [illegible] مگر اس کے ساتھ ہی [illegible] حالات کی [illegible] اس بات کا یقین ہے کہ مسلمان قوم کے [illegible] سے [illegible] سکتا ہے اور نہ اردو ہی کو [illegible] اگر اس کا رسم خط [illegible] اسے خودکشی کے لئے مجبور نہ کر دیا گیا۔

آخر میں چند باتوں کا ذکر کر دینا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک ہمارے دوستوں کے لئے قابل غور ہیں۔

(۱) ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے اردو زبان میں ہندی الفاظ کے علاوہ عربی و فارسی [illegible] الفاظ کا ذخیرہ ہے۔ اور اس حد تک کہ اگر یہ الفاظ اردو زبان سے خارج کر دیئے جائیں [illegible] تو اردو، اردو نہیں رہتی۔ چونکہ یہ عربی اور فارسی الفاظ اپنے اصل تلفظ اور املا کی صورت میں ہی اردو میں مستعمل ہیں۔ اس لئے ایک طرف اردو رسم خط کی وجہ سے [illegible] عربی زبانوں سے [illegible] دوسری طرف اردو کو [illegible] دیگر زبانوں کے مقابلہ میں ایک ... قومی حیثیت حاصل [illegible]

(۲) پاکستان کی تشکیل میں [illegible] کے بعد بحیثیت زبان اردو [illegible] مشترکہ [illegible] رسم خط بھی اردو [illegible] رسم خط کی [illegible] جب تک کہ [illegible] کیونکہ یہ مشترکہ [illegible] کی زبان [illegible] تقسیم ہو [illegible] پاکستان کی اردو کا رسم خط اردو [illegible] اور ہندوستان کی اردو کا [illegible] میرے نزدیک ملک کی تقسیم سے بھی [illegible] ہوگا۔

(۳) [illegible] اردو [illegible] رسم خط [illegible] ملک کے [illegible] دو زبانوں کے لئے اس حالت میں [illegible] رسم خط بھی اپنی جگہ قائم رہے [illegible] ناگری رسم خط کے ناقص ہونے کے [illegible] اردو الفاظ کے تلفظ پر زیادہ اثر پڑے گا کیونکہ اردو رسم خط کی وجہ سے اردو الفاظ کا [illegible] لہذا ناگری رسم خط میں [illegible] لکھے جانے پر [illegible] الفاظ کا صحیح تلفظ لوگ ادا کر سکیں گے۔

(۴) مختلف نشانات وضع کرنے کے بعد اگر دیوناگری رسم خط اردو الفاظ کے ادا کرنے کے قابل بن بھی گیا تو بھی اکثریت چونکہ مسلمانوں سے نفرت کرتی ہے لہذا اس اردو زبان کو جسے وہ مسلمانوں کی زبان کہتی ہے کیوں برداشت کرے گی۔ لہذا نہ تو دیوناگری رسم خط ہی زیادہ دنوں تک قائم رہ سکے گا اور نہ وہ اردو زبان ہی جو رسم خط اور زبان دونوں کے لحاظ سے محدود ہو گئی ہو۔ اور پھر یہ مختلف نشانات والا دیوناگری رسم خط بھی چند دنوں میں دشوار معلوم ہونے لگے گا۔ جسے بالآخر گرا دینا پڑے گا۔

اور اس طرح اردو زبان اردو رسم خط سے الگ ہو کر ہمارے مسئلہ کی [illegible] کے لئے قربان ہو جائے گی اور مسلمان بھی ہمارے [illegible] میں ہمیشہ کے لئے بھینٹ چڑھ جائے گا۔

ہو سکتا ہے کہ صدیقی صاحب کے نزدیک یہ محض اندیشے ہوں مگر آج کے حالات کے پیش نظر مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ اگر مسلمانوں نے اپنے مسائل پر صحیح طور پر غور نہ کیا اور محض جذبات سے کام لیا تو یہ اندیشے بہت جلد حقیقت بن کر رہیں گے۔

قومی زبانیں اور انکی نشوونما

مدن گوپال کی کتاب ([illegible])

کا

دسواں باب

گذشتہ سے پیوستہ

گذشتہ صدیوں میں اب [illegible] کروڑ [illegible] کی بولی جو شمالی چین اور [illegible] شاہی دارالسلطنت میں رائج تھی۔ بولتے ہیں [illegible] اس زبان کو "کیو یو" یا قومی زبان کا نام دیا [illegible] کتاب میں لکھا ہے [illegible] اس زبان نے کوئی ترقی کی ہے اور کچھ [illegible] کو ختم کیا ہے۔

جب تک ہماری حکومت کو [illegible] نہیں [illegible] اور اپنے کو [illegible] مستقبل قریب میں کوئی امید نہیں ہے [illegible] کو بھی انقلاب [illegible] سے گزرنا پڑے گا [illegible] اس کا امکان ہے کہ چینیوں کی طرح ہم بھی [illegible] اشتراکی ہو جائیں۔ [illegible] ایک [illegible] مخالف ہوں [illegible] ہندوستان کے [illegible] نشوونما ہو گا اس [illegible] ترقی پسندی سے کہیں بہتر ہے [illegible] ملک کی قومی زبان [illegible] اور [illegible] کی زبان رہے گی خواہ [illegible] اس کے خلاف کچھ یا [illegible] کو بھی [illegible] راہ داری دیا جائے اس ملک کی حکومت نہ تو جمہوری کہلا سکتی ہے۔ اور نہ غیر مذہبی۔

جہاں تک مجھے علم ہے۔ سوال کے اس پہلو پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ کسی زبان کی خصوصیت کی تعریف یہ ہے کہ رسم الخط کا وہ عنصر جو یہ بتاتا ہے کہ آدمی کیا سوچتا ہے اور کرتا ہے یہ قدرتی

امر ہے کہ عوامی نظام کا عکس عوامی زبان میں ملتا ہے "زبان ایک مندر ہے جس میں ان کی روحیں محفوظ ہیں جو اس کو استعمال کرتے ہیں، یہ اچھی طرح سے نہیں سمجھا جاتا کہ زبان ایک بار رائج ہو جانے کے بعد عوام کو متاثر کرتی ہے اور اس طرح عمل اور ردعمل کا تقابل ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ زبان بہت سرعت کرتی ہے یہ ذائل ہوتے ہی ترقی پاتی ہے اور ہر انسانی عمل سے اثر انداز بھی ہوتی ہے"

سنسکرت ہمیشہ ایک طبقے کی زبان رہی ہے جو اپنے کو دوسروں سے برتر سمجھتا رہا ہے۔ عوام ہمیشہ دیسی زبان میں بولتے اور گاتے رہے ہیں فی الواقع دیسی زبانوں کو دبانے سے اور بڑے ناقابل تلفظ الفاظ متعارف کرنے سے یا جن کا تلفظ آسان نہ ہو، اس طرح کیا / عوام کو دبا نہیں رہے ہیں اس کے علاوہ سنسکرت ایک خاص مذہب کی زبان رہی ہے اگرچہ وہ خاص شیو فرقہ کی نہ تھی۔ تمام دوسرے فرقوں، جین، بدھ، وشنو اور سکھ نے دیسی زبانوں میں تبلیغ کی ہے۔ کیا ہم ایک خاص فرقے کی زبان کو فوقیت دے کر غیر مذہبی رہتے ہیں؟ اب تک جیسا کہ میں نے پچھلے ابواب میں ذکر کیا ہے تمام جدید ہندوستانی زبانوں میں یہ رجحان رہا ہے کہ تلفظ کو سہل تر بنایا جائے اور الفاظ کو مختصر کیا جا رہا ہے۔ اب ہندی میں اس کے مخالف رجحان ہے اس کا مطلب ہے کہ زبان کی عادت کو بدلا جا رہا ہے؟ تمام عمرانیات کے ماہر اس بات پر متفق ہیں کہ زبان کی عادات کو بدلنا نظام کے بدلنے کا کھلا ثبوت ہے "یہ مانتے ہوئے کہ نظام اور زبان کا ایک رشتہ ہے جو زمانہ قدیم میں ضمنی اور غیر ارادی رہا ہے، کہاں تک یہ ممکن ہے کہ مستقبل کے نظام کو بدلنے کے لئے زبان کی اسکیم کو جبراً چلایا جائے"

پھر سوال اٹھتا ہے کہ کیا ہندوستان میں یہ کرنا جمہوری طریق کار ہے؟ میں اپنے آقاؤں یعنی حکومت سے یہ سوالات پوچھنے پر مجبور ہوں، وہ اپنے دلوں کی تلاشی لیں اور اپنے خیال اور پیشے کا تقابل کریں۔ اس کا تو مجھے یقین ہے کہ ہندی کے زبان بننے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر تاریخ کبھی رہبری کرتی ہے تو کھالی کبھی زبان نہیں بن سکتی۔ گو کہ کسی بھی زبان میں بہت سے عامیانہ الفاظ داخل ہو جاتے ہیں۔

یہاں میں اس کا ذکر کر دوں کہ جہاں تک ہندی کا تعلق ہے ایک ہندوستانی کمیونسٹ، نہ صرف نقل کرتے ہیں بلکہ ہندوستانی فرقہ پرست سے کئی ہاتھ آگے ہیں۔ مثال کے طور سے کتنے لوگ یہ عنوانات سمجھ پائیں گے جو روس کی نمائش میں تھے "اکار شٹ، الشیٹ کا اکراہان"، "نو دورش کی اپلا کشیا، جس کا مطلب ہے "بہترین شاگرد" "سرمئی کھاتہ"، اور "نئے سال کا موقع" روسی ایک ترکیبی زبان ہے۔ اس لئے ایک قدیم زبان ہوئی جیسے سنسکرت۔ روسیوں کو سنسکرت زبان اپیل کرتی ہے بہ نسبت تحلیلی زبان کے جیسے ہندوستانی۔ اگر ہندوستانی کمیونسٹ کو اپنی رائے رکھنے کا حق نہیں ہے اور اسے روس سے احکامات

اپنے مندری میں تو ہم کچھ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے [illegible] سے کئی ہاتھ آگے ہیں

شاید پاکستانی تو، ہندوستانی [illegible] زیادہ [illegible] ہے

بہر حال اس ملک میں بھی اردو کی ترقی کی راہ میں مشکل نظر نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے ہندی والوں کی طرح نہیں، کہ نامور اردو کے ادباء اور شعراء پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہ عام فہم زبان استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اب بھی بہت سے ایسے ہیں، اپنے ہندی کے ساتھیوں کی طرح جن کو اس کا خیال رہتا ہے کہ وہ کیسے کہتے ہیں ذکر کیا گیا ہے ہیں۔

فلپائن بہت سے جزیروں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے کچھ خاصے بڑے جزیرے ہیں۔ اس لئے فلپائن میں بہت سی بولیاں بولی جاتی ہیں ہمارے اور اس ملک میں مماثلت کے کئی نکتے ہیں۔ اس لئے وہاں قومی زبان بنانے کی کوشش کی تاریخ ہمارے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ زیادہ تر بولیوں کا ماخذ ملایا پالی انڈونیشین ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ایک بولی کو استعمال کرنے والے، دوسری بولی کے استعمال کرنے والوں کو نہیں سمجھ سکتے لیکن وہ گرد کی زبان سیکھتے ہیں۔ کوئی بھی بولی غالب نہیں ہے اس لئے کہ سنسکرت چینی، ہسپانوی اور انگریزی کے الفاظ کافی تعداد میں ان میں شامل ہیں سیاسی، تجارتی اور ثقافتی وجوہ سے فلپائن کی صدیوں سے ایک غیر ملکی زبان استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ پہلے ہسپانوی پھر کسی حد تک انگریزی ۱۹۳۹ء کی مردم شماری سے یہ معلوم ہوا کہ ۲۶ فیصدی فلپائنی انگریزی بول سکتے ہیں۔ ظاہر ہوا کہ انگریزی خاص نہیں، ہماری طرح کی انگریزی ہے بلکہ ملایائی قسم کی ہے

عوام کو اپنی ترقی کی ابتدا میں غیر قومی ہونا بہ حیثیت ایک انگریز یا ہسپانوی ہونے کے ضروری ہے۔ جب قومی زبان کا سوال دستور ساز کمیٹی کے سامنے بحث کے لئے آیا تو انگریزی کے لئے کوئی امکان نہ تھا، اس کی دو واضح دلیلیں انگریزی کو قومی زبان بنانے کے خلاف پیش کی گئی تھیں۔ پہلی یہ کہ انگریزی ایک غیر ملکی زبان ہے، دوسری یہ کہ شاید کبھی بھی انگریزی فلپائنیوں کی سمجھ کی زبان نہ بن سکے۔ ان کے پاس ایسے تمام الفاظ جیسے ہندوستانی میں تھے جو بہت سی بولیوں اور زبانوں کا احاطہ کرتی ہے لیکن ایک بولی نہیں ہے جیسا کی مدد سے وہ کوئی خاص بولی یا زبان کو مستقبل کی قومی زبان بنا سکتے جیسا زبان کے آئین سے ظاہر ہوتا ہے کہ قومی خودداری اس بات کی داعی تھی کہ ایسے اقدام اٹھائے جائیں جس کی ترقی سے عام قومی زبان اختیار کی جا سکے اور جو دیسی زبانوں سے ماخذ یا اس پر مبنی ہو۔

چیانگ کائی شیک کی قومی چینی حکومت اور ہمارے ہندوستانی کانگریسی حکومت کی طرح، فلپائن کی حکومت نے "آئینی حکم" پر تیزی سے عمل کیا انھوں نے ایک انجمن کی تشکیل کی اور اس کا نام "ادارہ قومی زبان" رکھا۔ اس انجمن نے کافی غور و فکر کے بعد ٹگالوگ بولی کے اختیار کئے جانے کی حمایت کی جو انگریزی کے بعد سب سے زیادہ سمجھی جاتی ہے اور اس کو قومی زبان بنانے کی بنیاد قرار دی گئی۔ ٹگالوگ کا رسم الخط بہت کم استعمال ہوتا

ہے۔ اس لئے ان کی قومی زبان نے لاطینی رسم الخط کے استعمال کو بہتر خیال کیا ۳۰ دسمبر ۱۹۳۷ء کو صدر نے ٹیگالوگ کے قومی زبان ہونے کا اعلان کیا۔ ۱۹۴۰ء میں ٹیگالوگ قانوناً ملک کی سرکاری زبان قرار پائی۔ چندہ سال کے بجائے اس کو ۴ جولائی ۱۹۴۶ء (فلپائن کی آزادی کا دن) سے لاگو کیا گیا۔

پہلے پہل ٹیگالوگ بہ حیثیت قومی زبان کے فیصلے کو بغیر کسی احتجاج کے مان لیا گیا لیکن جب پبلک اسکول میں ٹیگالوگ میں پڑھائی شروع ہوئی تو اس وقت کافی احتجاج ہوا۔ یہ کہا جانے لگا کہ ٹیگالوگ بہ حیثیت ذریعہ تعلیم ٹیگالوگ بولنے والے بہت کم بچے پیدا کر دیتے ہیں کو سیکھنے میں بالکل قیمتی ہے کیونکہ تلفظ یہ ہے کہ انہیں انگریزی میں تعلیم پانے والوں کے مقابلے میں پچھڑ جانا پڑتا ہے۔ اور یہ کہ ٹیگالوگ اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے جو دور میں بھی مل جاتی ہے۔ یہ صورت حال ہمارے آج کے ہندوستان سے بہت مماثلت رکھتی ہے۔ ان دقتوں کے پیش نظر وہاں کی حکومت یہ ماننے پر مجبور ہوئی کہ تمام سرکاری طلبہ کو ۱۹۵۰ء کے آخر تک ٹیگالوگ کو پھیلانے کے سلسلے میں بہت کم کامیابی ہوئی ہے۔ ہماری حکومت میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ سکے۔ اس سے کہ آقا اور جی حضوری کی ناراضگی کا خوف ہے۔

آج فلپائن میں زبان کا مسئلہ بہت الجھا ہوا ہے۔ انگریزی اور ٹیگالوگ بھی سرکاری زبانیں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ فلپائنی طالب علم اسکول چھوڑ جانے کے بعد کوئی زبان لکھ سکتا ہے نہ بول سکتا ہے۔ وہ ٹیگالوگ یا انگریزی بولنے تک کہ اپنی دیسی زبان بھی نہیں ۔۔۔۔ تجویز یہ ہے کہ ہر علاقے کی زبان کو تین سال تک ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ وہ طالب علم جو اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ انگریزی پر زور دیں۔ جیسے وہ کالج کی تعلیم میں پڑھتے جائیں۔ لشیستا تا ہندمیں یہ طریقہ بڑی کامیابی سے جاری ہے اور غیر منقسم ہند میں بھی خاصا کامیاب رہا تھا۔ اس کے کچھ نقصانات بھی ہیں لیکن یہی عملی ہے (لیکن یہ غیر قومی ہے؟) اس پر شاید ہی سنجیدگی سے کوشش کی گئی ہو سوائے ان چند پبلک اسکولوں کے جو خوشحال خاندانوں کے لئے ہیں۔ اس سے ملتے جلتے واقعات ہندوستان میں بھی ہو رہے ہیں۔ لیکن ان کو مشتہر نہیں کیا جاتا ۔۔ اصل میں یہ شرم کی بات ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام کم نصیب خاندانوں کے بچوں کے ساتھ امتیازی سلوک کا برتاؤ کرتا ہے تاکہ عمل اور خام لسانی تجربہ کو جاری رکھا جائے۔ خاص کر جب ہمارے ماہرین تعلیم بجائے عقل کے تعصبات کے پیچھے ہیں۔

ہمارے کچھ امور سیاست داں قومیت کے بارے میں اپنی فرقہ پرستی کو چھپائے ہوئے ہیں۔ وہ شدید زبان کا نعرہ لگاتے ہیں یہ نہ تو اچھا ہی ہے اور نہ ہی آج کی تیز خبر رسانی کے زمانے میں ممکن ہے اس میں کوئی دانشمندی نہیں ہے کہ ہماری زندہ زبان ایک مردہ زبان کا دم چھلہ بنی رہے۔ اپنی مادری زبان پر فخر کیا قدرتی ۔۔ ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مردہ زبان پر ناز کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ زبان کے معاملے میں مزدوروں سے کام لینا قومی غیر داری کا کھلا ہوا ثبوت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ۔۔ قومیت کا نظریہ

خود اور دوسرے ناقابل تحمل ذرائع پر منحصر ہے اس لئے اس قومی جذبے کی زوروں سے مذمت کرنی چاہئے۔

کوئی بھی قومی زبان صرف اپنے سرمایہ پر باقی نہیں رہ سکتی اگر وہ ایک زبان کی حیثیت سے رہنا چاہتی ہے نہ کہ ایک قبرستان کی طرح ۔۔۔۔ تمام زبانیں ایک بولی سے نکلی ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی بولیوں اور ان کے اقسام کو نظرانداز نہیں کر سکتی جن کی جگہ انھوں نے جغرافیائی یا سیاسی وجوہ سے اختیار کر لی ہو۔ دیسی زبانوں کی طرح مشہور زبان گنوار روزمرہ اور گندے الفاظ سے بھری ہوئی ہے لیکن شوخ محاورات سے بھی لبریز ہوتی ہے اور الفاظ دین کی طرح پاکیزہ اور کانوں کے لئے لطیف ہوتے ہیں" اور قدیم الفاظ بھی ترمیم و تنسیخ کے بعد بدقسمتی سے معیاری زبان سے خارج کر دیئے گئے ہیں۔ یہ محض حماقت ہے کہ ایسے الفاظ اور محاورات کو نہ اختیار کیا جائے جو ہماری زبان کی روحانی قدر کو بڑھا سکتے ہیں۔ "عظیم دلویدی" اور ان کا اسکول مردہ زبان کے مطالعے کی وجہ سے اس کی پاکیزگی کو سمجھنے سے قاصر تھے اور ان گنوار محاورات کی طاقت سے ناواقف تھے۔ وہ ان کو بازاری کہتے تھے۔ انسانی زبان بہرحال عوام کی پیداوار ہے سطح کی تخلیق نہیں ہے۔ یکان پڑھے عام آدمیوں کی ۔۔۔۔ پڑھے لکھے اس کو تراش خراش کے ایک ادبی زبان بنا سکتے ہیں۔ لیکن یہ عوام ہی ہیں جو اس کو زندگی بخشتے ہیں اور زندہ رکھتے ہیں۔ ہمارے محقق یہ بھول جاتے ہیں کہ نایاب پھول (کسی بھی زبان کے) جنگلی پودے ہی سے نکالے جاتے ہیں اور ان کی جڑیں (عوام) زمین کے اندر گہری ہوتی ہیں۔ اور وہ زمین ہی سے غذا لیتا ہے۔ ورنہ وہ ختم ہو جائے۔ بالکل ہماری قدیم ادبی زبانوں کی طرح جب وہ مشہور بولیوں سے الگ کر لی گئی تھیں۔ دیسی زبانیں اگر لچیلی پڑھی جائیں تو ایک خزانہ رکھتی ہیں جس سے ایک زبان کو مالا مال کیا جا سکتا ہے اور ہمارے ملک میں کان کن چند ہی ہیں۔ ہم لوگ "لغات کو کھودنا" جانتے ہیں۔

لفظ کے تبادلے کا طریق عمل ایک بڑے بین الاقوامی بنک کی طرح ہے جہاں مختلف ممالک کے روپے اس کی سپردگی میں رہتے ہیں اور اس مثالی خصوصیت کے ساتھ کہ قرض لے کر کبھی واپس نہیں کرتے ایسے کسی بنک سے فائدہ نہ اٹھانا بیجا ناز معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ترکیبی زبانیں مثلاً جرمنی تراجم کے قرض کو فوقیت دیتی ہیں۔ ترکیبی زبانیں تراجم کے قرض کو الفاظ کے قرض پر ترجیح دیتی ہیں لیکن ہماری جدید تحلیلی زبان کیوں زبان کو (الفاظ کا قرض) فوقیت دے صرف اس واسطے نہیں کہ سنسکرت ایک ترکیبی زبان ہے۔ یہ میرے فہم سے باہر ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا کوئی زبان آنے والوں کو داخل کر کے شہریت دیکھ کر خراب بنتی ہے؟

(باقی آئندہ)

ایک بھولا ہوا کتب خانہ

(از جناب حاجی محمد زبیر صاحب۔ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

اگر کوئی چیز ہماری علمی روح کو بیدار کر سکتی ہے تو وہ ان علمی کارناموں کی یاد ہے جو تاریخ کے اوراق میں بکھری پڑی ہے یہ پرانی یادیں جس قدر دہرائی جائیں گی اسی قدر علمی رجحانات میں شعور پیدا ہوتا جائے گا۔ آج اٹھارویں صدی کے ایک علم دوست سلطان کی علمی زندگی کا کچھ ذکر کیا جاتا ہے۔ اس سلطان کا نام ابوالفتح سلطان علی ٹیپو ہے۔ یہ ذکر اس زمانے کا ہے جبکہ ہندوستان میں سلطنت مغلیہ دم توڑ رہی تھی اور مغربی سرمایہ داری کا اقتدار بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ ایسے سخت وقت میں سلطان نے علم و ادب کی سرپرستی کرکے اپنی علم دوستی کا جو ثبوت دیا ہے۔ وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

سلطان کی علمی خدمات

میدان جنگ میں سلطان کی بہادری اور پامردی کو دنیا اچھی طرح جانتی ہے۔ لیکن علم و ادب کے میدان میں اس نے جو بھی بازی جیتی ہے۔ اسے بہت کم اجاگر کیا گیا ہے۔ حالانکہ تاریخ بتاتی ہے کہ سلطان صرف فنون جنگ ہی میں ماہر نہ تھا بلکہ علم و ادب میں بھی اسے اتنا کمال حاصل تھا کہ اس کے دشمن بھی اسے ایک بلند پایہ اہل قلم تسلیم کرتے ہیں چنانچہ کرنل کرک پیٹرک نے سلطان کی علمی قابلیت کے متعلق لکھا ہے "سلطان کی تحریر دوسری تحریروں سے بالکل متمیز تھی اس قدر مختصر اور پیچیدہ ہوتی تھی کہ ایک ایک لفظ سے کئی معنی نکلتے تھے۔ تحریر کا خاص وصف یہ تھا کہ وہ ایک ہی نظر میں پہچانی جاتی تھی کہ یہ سلطان کے قلم سے نکلی ہے"

کیسل کا بیان ہے کہ "سلطان نہایت آسانی سے نثر و نظم لکھتا تھا اور اس کے مضمون میں ایک خاص شان پائی جاتی تھی۔"

لیکن تقدیر کا تلون بھی عجب چیز ہے جس نے سلطان کو اپنے علمی ذوق کو پورا کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ پھر بھی اس نے علم و ادب کی ترقی اور اشاعت کے لئے مدرسے کھولے کتب خانے قائم کئے۔ اہل علم کو وظیفے دئے۔ عوام کی تعلیم کے لئے سرنگاپٹم میں ایک یونیورسٹی "جامع الامور" قائم کی جہاں مذہبی علوم کے علاوہ فلسفہ۔ ریاضی۔ اور طب کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس علم دوست سلطان کی سرپرستی میں تصنیف و تالیف کے کام بھی انجام پائے۔ تحفۃ المجاہدین اور وقائع منازل جیسی کتابیں سلطان کی ذاتی نگرانی میں لکھی گئیں۔ مصنفین کی تعداد ۵۰ بتائی جاتی ہے اکثر اہل قلم تصانیف و تراجم بھی اپنے ادب نواز سلطان کے نام معنون کرتے تھے۔ شاہ حسین علی جو ملک الشعراء تھا اس نے مفرح القلوب کا ترجمہ دکنی زبان میں کرکے سلطان کے نام معنون کیا تھا۔ سلطان کے ان سب علمی کارناموں کی یاد اب کچھ دھندلی اور پراگندہ ہو گئی ہے لیکن ان کی زندگی تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ باقی رہے گی۔

سلطان کو علم سے اتنی محبت تھی کہ وہ لڑائی کے جوش یا فتح کی خوشی، غرض کسی حال میں بھی کتابوں کی بے عزتی اور بربادی اسے گوارا نہ تھی۔ ایک بار قلعہ ادھونی کی فتح کے موقع پر مال غنیمت میں نواب مہابت جنگ کا کتب خانہ سلطان کو ملا۔ لیکن اس نے فتح کے نشے میں ان کتابوں کو برباد نہیں کیا بلکہ انھیں سرنگاپٹم بھیج دیا۔ سلطان کے اس اونچے کردار کا موازنہ جب ان فاتحین سے کیا جاتا ہے جن کے ہاتھوں بغداد قرطبہ اور ہندوستان کے کتب خانے برباد ہوئے تو سلطان دنیا کے علم دوست بادشاہوں کی صف میں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

سلطانی کتب خانہ

سلطان نے اپنے ادبی ذوق اور شوق مطالعہ کی خاطر کتابوں کا ایک ذخیرہ جمع کیا تھا۔ وہ اپنی بہت سی گھڑیاں ان کتابوں کی صحبت میں گزارتا اور جب کبھی وہ اپنے ساتھیوں کی کم ظرفی سے کبیدہ خاطر ہونے لگتا تو یہ کتابیں اس کی غمگسار اور ہمدرد ثابت ہوتیں۔ سلطان کے کتب خانے میں دو ہزار کتابیں تھیں۔ ان میں شاہان بیجاپور اور گولکنڈہ کے خزاں دیدہ ذخائر بھی اکثر شامل ہو گئے تھے۔ اس کتب خانے کی بہت سی کتابیں زمانہ کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گئیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایک بڑا قیمتی اور نایاب نسخہ تباہی سے بچ گیا ہے۔۔ شاہنشاہ عالمگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن ہے۔ خط نسخ کا اعلیٰ نمونہ اور جلد بندی کا بہترین شاہکار ہے۔ اسے سلطان نے بڑی عقیدت کے ساتھ نقش و نگار سے آراستہ کرایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس تزئین پر پونے ہزار روپیہ صرف ہوا۔ اس قرآن میں خوبصورت اور دلکش جلد میں سلطان کے حسن ذوق کی جھلک نظر آتی ہیں۔۔۔ اسے سلطانی کتب خانہ کی جان سمجھئے لیکن صد حیف کہ باد مخالف کے جھونکوں نے اسے انگلستان پہنچا دیا اور اب یہ لندن میں ونڈسر کیسل کے کتب خانہ کی زینت بنا ہوا ہے۔

کتب خانہ کی ترتیب و تنظیم

کتب خانہ کے لئے کتابوں کی فراہمی، کتابت کا انتظام۔ غرض کتب خانہ کے سارے کاموں پر سلطان کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ سلطان کو کتابوں کی جلد بندی اور نقاشی کا بھی بڑا خیال تھا۔ جلد بندی کے متعلق وہ ہدایتیں جاری کرتا جلد ساز اپنے سلطان کی خوشنودی کے لئے کتابوں پر طرح طرح کے بیل بوٹے بناتے۔ جلد بندی کرتے وقت اکثر کتابوں کے چاروں

کوڑیوں پر تھے۔ اس لئے ان کے نام منقش کئے جاتے۔ بعض پر سلطان کا نام بھی لکھا ہوا۔ سلطان کی ہدایات کے بموجب شاہی مخطوطات کی نقاشی (؟) بعض کتابیں ایسی بھی تھیں کہ جن کی جلدیں ہیرے اور جواہرات سے مرصع تھیں۔ کتب خانے کے کام میں سلطان کی دلچسپی کا اندازہ کرنے کے لئے اس کے یہ خطوط پڑھئے۔

۱۰ جولائی ۱۷۸۵ء کو سلطان نے لکھا ہے۔

"کتاب فخر الشیوخ کی ایک جلد بذریعہ ڈاک بھیجی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کاتبوں سے اس کتاب کی دس نقلیں نہایت خوشخط کرائی جائیں۔ پھر آگے اور پیچھے پندرہ پندرہ سادہ ورق لگا کر جلد بندی کرائی جائے۔ تاکید رہے کہ یہ کام جلد کرا کر نقلیں یہاں حضوری میں بھیج دیں اور اپنے محکمے کے رجسٹر میں اس امر کا اندراج کر لیا جائے۔ چند دن پہلے تم کو یہاں سے کتابیں اور فہرست بھیجی گئی تھی۔ فہرست کے مطابق جانچ کر انھیں ہمارے کتب خانہ میں داخل کریں۔ اور اس محکمے کے رجسٹر میں ان کے نام درج کئے جائیں۔ ان کتابوں میں سے سات کتابیں ہمارے پاس ہیں۔"

۱۰ اگست ۱۷۸۶ء کو سلطان نے لکھا۔

"تحریر کیا جاتا ہے کہ کتاب "مفرح القلوب" کی دس نقلیں روانہ کی جا رہی ہیں۔ ان میں پانچ نقلیں مفصل ہیں۔ ان کی جلد بندی کرتے ہوئے اوپر نقرئی قفل لگائے جائیں۔ اور باقی پانچ نقول میں اس کتاب کا مختصر اقتباس ہے۔ ان پر قفل لگانے کی ضرورت نہیں۔"

۲۹ دسمبر ۱۷۸۶ء کو سلطان نے لکھا۔

"یورپ سے ایک کتاب ابھی آئی ہوئی ہے۔ جس میں آلات حرب و ضرورت کے متعلق معلومات درج ہیں۔ اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کر کے حضوری میں پیش کیا جائے۔"

سلطانی کتب خانہ کے متعلق میجر اسٹورٹ نے لکھا ہے "کتب خانہ کی ترتیب و تنظیم کے لئے ایک مہتمم مقرر تھا۔ سلطان کو تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا۔ سلطان کے حکم اور فرمائش سے بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر فوجی اور دیوانی معاملات سے متعلق ہیں۔ سلطان نے اپنے قوانین کے متعدد مجموعے تیار کرائے تھے جو اس وقت بھی یورپ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ سلطان جو کتاب مطالعہ کر چکا ہوتا اس پر مہر لگا دیتا تھا۔ اس طرح اکثر کتابوں پر مہریں ثبت ہیں۔"

کتب خانہ کا حشر

کتابوں کی تقدیر بڑی حد تک انسان کے ہاتھ میں ہے۔ قدر دان انھیں عزیز رکھتے ہیں اور نا قدرے ان کو برباد کر دیتے ہیں۔ سلطان کے مر جانے کے بعد ان کی کتابیں بھی ایسے نا اہلوں کے ہاتھ آئیں جنھوں نے چھ برس تک ان کی خبر ہی نہ لی اور وہ بڑی کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہیں۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ ہزاروں میں سے صرف ساڑھے چھ سو کے قریب باقی رہ گئیں۔ ان کی دیکھ بھال کرنل کرک پیٹرک کے سپرد کر دی گئی۔ پھر میجر اسکورٹ نے ان کی فہرست مرتب کی جو ۱۸۰۹ء میں کیمبرج سے شائع ہوئی۔ اس فہرست کا خلاصہ یہ ہے۔

قرآن	۴۴	تصوف	۵۲	فقہ	۶۲	نظم	۱۹	ریاضیات	۷
حدیث	۴۴	ابیات	۲۴	ہندی اور دکنی انشا	۴۴	ہندی نظم	۴۲		
نجوم	۲۰	وظائف	۳۵	فلسفہ	۵۴	فرہنگ و لغات	۲۹		
ترکی نثر	۲	آرائش	۱۰	تعبیر	۴۱	اخلاقیات	۲۴		
قصص و حکایات	۱۸	زبان	۴۵	طب	۶۲				

یہ کتابیں اپنے نئے مالکوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر ادھر ادھر منتشر ہو گئیں۔ چند کلکتہ کی بنگال رائل ایشیاٹک سوسائٹی کو دے دیں۔ باقی سب انگلستان بھیج دیں جو انڈیا آفس لائبریری میں شامل ہو گئیں۔

کتابوں کا تعارف

رائل ایشیاٹک سوسائٹی کو جو کتابیں ملیں ان کے نام یہ ہیں۔

رسالہ یدکما، منتخب ضوابط سلطانی۔ رسالہ بحری، تحفۃ المجاہدین، وقائع منازل۔ روز نامہ دکھن و حیدر آباد۔ نیو دست نبدات، فرامین، جگرنامہ

ان کتابوں میں سے ایک کا حال بھی سن لیجئے۔ یہ کتاب تحفۃ المجاہدین ہے۔ اسے فتح المجاہدین بھی کہتے ہیں۔ اس کو سلطان نے اپنے فوجی محکمے کے لئے لکھوایا تھا۔ اس میں فوج کے قواعد و ضوابط درج ہیں۔ کتاب میں آٹھ باب اور ایک ضمیمہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے سلطان کے فوجی نظام کا پورا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ یہ کتاب سلطان کی انتظامی قابلیت اور حسن تدبیر کا پتہ دیتی ہے۔ [illegible] سلطنت خداداد کے مصنف نے دیکھا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ کتاب پر سلطان کی مہر لگی ہوئی ہے اور ہر مضمون کے آخر میں اس کے دستخط ہیں۔

سلطانی کتب خانہ کی جو اردو کتابیں اب انڈیا آفس لائبریری میں ہیں، ان کا تعارف ہم اپنے ناظرین سے کراتے ہیں۔ سب سے پہلے عادل شاہ بیجاپور کے درباری شاعر ملا نصرتی کی دو تصانیف دیکھئے۔ علی نامہ۔ شاہ نامہ فردوسی کے جواب میں شاہنامہ دکن ہے۔ یہ ۱۰۷۶ھ میں لکھی گئی ہے۔ گلشن عشق چار ہزار شعروں کا مجموعہ ہے۔ صفحات تین سو۔ اس کی تصاویر دیکھنے کے لائق ہیں۔ آرٹ کا بہترین نمونہ ہیں۔ یہ ۱۰۶۸ھ کی تصنیف ہے۔ کلیات قطب شاہ۔ محمد قلی قطب شاہ فرمانروائے گولکنڈہ کے فارسی اور دکنی کلام کا مجموعہ ہے۔ صفحات سوا سو۔ سن تصنیف ۱۰۲۵ھ۔ قصہ لعل و گوہر۔ عارف الدین خاں المتوفی ۱۲۰۶ھ کی تصنیف ہے۔ سلطان کے حکم سے

میر حسن عزت نے اس کا ترجمہ اردو سے فارسی میں کیا تھا۔ اس میں بنگالہ کے بادشاہ زمرد شاہ کے شہزادہ لعل شاہ اور جنات کے بادشاہ کی لڑکی گوہر کے عشق کا ذکر ہے۔ میر جعفر شاہ کی فارسی کوک شاستر کا دکنی ترجمہ بھوگ بل۔ یہ امیر خاں کے عہد میں بمقام گولکنڈہ لکھی گئی۔ اس میں ڈیڑھ سو صفحات ہیں۔ تذکرہ شعرائے ہند کا مرتب علی حسین نے ۱۱۹۹ھ میں لکھی۔ اس میں ایک سو شعراء کے حالات درج ہیں۔ انعام اللہ خاں یقین کا دیوان یقین ۱۱۵۵ھ میں لکھا گیا۔ انعام اللہ خاں حضرت مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ انعام اللہ خاں کی عمر ابھی پچیس سال کی تھی کہ ان کے باپ نے کسی تصور میں ان کو قتل کر دیا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر ابن نشاطی کی کتاب پھول بن نظم و نثر کے مضامین کا مسور مجموعہ ہے ۱۰۶۶ھ میں لکھی گئی۔ اسی مصنف کی دوسری کتاب طوطی نامہ ہے جو ۱۰۴۹ھ میں لکھی گئی۔ اس میں ۵۲ کہانیاں ہیں جو طوطے کی زبان سے بیان کی گئی ہیں۔ رسالہ سرود و راگ قدیم دکنی غزلیات کا مجموعہ ہے۔

مفرح القلوب کا ذکر آپ پہلے سن چکے ہیں ملک الشعرا حسین نے اس کا ترجمہ دکنی زبان میں کر کے سلطان کے نام معنون کیا تھا۔ شاہ درویش گجراتی کی کتاب دستور ہندی تصوف کی تین کتابوں کا ترجمہ ہے۔ نشاط العشق شرح غوثیہ ایک بڑی نایاب کتاب ہے یہ حضرت غوث الاعظم کی فارسی کتاب کا دکنی ترجمہ ہے۔ قصہ رضوان شاہ ایک دکنی شاعر فائز کی مثنوی ہے صفحات تین سو اور سن تصنیف ۱۱۳۵ھ۔ اسی شاعر کی ایک اور کتاب قصہ روح افزا ہے۔ خلاصہ سلطانی سید امام الدین اور محمد صدر نے سلطان کے نام سے قدیم اردو نثر میں لکھی ہے۔ ندر سکھار ہندی ایک سنسکرت کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ مفتاح الصلوٰۃ کا ترجمہ شیخ محمد میاں پونی نے کیا ہے۔ روضۃ الشہدا سید ولی ویلوری کی کتاب ہے قصہ بہرام و گل اندام طبعی گولکنڈوی کی مثنوی ہے اس میں ۲۴۴۰ بیت اور ۲۰۰ صفحات ہیں۔ ۱۰۹۰ھ میں لکھی گئی۔ قصہ بداوت دکنی بھی طبعی گولکنڈوی کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ۱۱۴۳ھ کی تصنیف ہے۔ سری گنیش سنسکرت کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے کلید تنگی بھی ہے۔

یہ کتابیں ٹیپو سلطان کے ادبی ذوق کے زندہ نمونے ہیں۔ ابھی تک لندن میں موجود ہیں۔ ان کتابوں کو جلا وطن ہوئے ڈیڑھ سو برس سے زیادہ ہو گئے اب تو انہیں اپنے وطن میں لوٹ آنا چاہئے۔ ان کے دیکھنے سے سلطان کی علمی زندگی کی یاد تازہ ہو جایا کرے گی۔ ایسی زندگی کی یاد جو حصول علم کا جذبہ ابھارے گی اور شوق مطالعہ پیدا کرے گی جب تک یہ کتابیں باقی ہیں یہ یاد بھی باقی رہ جائے گی۔

ہندی پرچار سبھا حیدرآباد میں

قاضی محمد عبدالغفار صاحب کا خیر مقدم

۱۴ جولائی کو حیدرآباد کی ہندی پرچار سبھا میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کا شاندار سواگت کیا گیا۔ جلسہ کے صدر نواب مہدی نواز جنگ وزیر طبابت و صنعت حاصل تھے۔ جلسے میں حیدرآباد کی متعدد ممتاز خواتین ممبران اسمبلی، صحیفہ نگار اور ادیب موجود تھے۔

شری دی۔ سری نواس لاہوٹی نے اور ان کے بعد سبھا کے معتمد مسٹر رام شرما صاحب نے اپنی تقریروں میں قاضی صاحب کو خراج تحسین پیش کیا۔ اور خاص طور پر ان کی ان خدمات کا ذکر کیا جو انھوں نے اپنے ۱۲ سالہ قیام حیدرآباد میں بہ حیثیت ایک اخبار نویس اور ادیب کے انجام دی ہیں۔ شرما صاحب نے اپنی جامع تقریر میں صاف صاف اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ ہندی اور اردو دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ایک کے بغیر دوسری مکمل نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے فرمایا کہ اردو اور ہندی ہماری رگ رگ میں بسی ہوئی ہے۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہی چل سکتی ہیں۔ الگ الگ نہیں چل سکتیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہندی اور اردو دونوں زبانوں کو زیادہ آسان اور سلیس بنایا جائے۔

قاضی عبدالغفار صاحب نے اپنی تقریر میں اس امر کی وضاحت کی کہ شمالی ہندوستان میں اردو ہندی کا جھگڑا بالکل بے معنی ہے۔ اس لئے کہ یہ دونوں زبانیں ساتھ ساتھ رہ کر ایک دوسرے کے لئے مضر نہیں ہو سکتیں۔ یہ جھگڑا دراصل لسانی نہیں ہے۔ بلکہ سیاسی بنیادوں اور تنگ نظری سے پیدا ہوا ہے۔ درحقیقت اردو ہندی کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔

انھوں نے فرمایا کہ میں انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہندی کی مخالفت یا ہندی سے بیزاری کا الزام جو اردو والوں پر لگایا جاتا ہے محض بے بنیاد ہے۔ فرقہ پرستی اور پاکستانی یا مسلم لیگی ذہنیت کے جو طعنے اتر پردیش میں اردو والوں کو دیئے جاتے ہیں وہ خود معترضین کی تنگ دلی کا ثبوت ہیں۔ مثلاً انھوں نے بتایا کہ دشمنوں کی جانب سے اتر پردیش میں دو سال تک یہ دعویٰ کیا گیا کہ اس تحریک میں فرقہ پرستی یا تعصب کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اس تحریک میں جب ہمارا کارکن سارے صوبے میں کام کر رہے تھے کبھی کسی شخص کی زبان سے ایک حرف بھی ہندی کے خلاف ادا نہیں ہوا بلکہ ہر جگہ ہمارے کارکن اردو والوں کو بتاتے رہے کہ انھیں پورے ذوق و شوق سے ہندی پڑھنی چاہئے۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ یہ عجیب بات ہے کہ جب ہم غیر ملکی زبان انگریزی کو سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے بخوشی پڑھتے تھے تو اب اپنے ملک کی ایک زبان سے جو سرکاری زبان ہے بیزار ہوں۔

انھوں نے فرمایا کہ یہ سچ ہے کہ جب دستور ساز مجلس میں سرکاری زبان کا مسئلہ زیر بحث تھا تو ہم نے یہ کوشش کی تھی کہ گاندھی جی کی تجویز کے مطابق دونوں رسم الخطوں میں ہندوستانی کو سرکاری زبان بنایا جائے۔ لیکن ہم جب آزادی کے بعد اپنے ملک میں جمہوریت کو تسلیم کر چکے ہیں تو پھر ہمارا یہ فرض ہے کہ اکثریت کے فیصلوں کو خوش دلی کے ساتھ قبول کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہم نے کیا۔

قاضی صاحب نے فرمایا کہ ہمارے ملک کے دستور میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مشترکہ تہذیب کا بہترین نمونہ ہم حیدرآباد میں دیکھ سکتے ہیں۔ باوجودیکہ شمالی ہندوستان میں اس مشترکہ تہذیب کو ہر طرح برباد کیا جا رہا ہے۔ لیکن حیدرآباد نے اپنی قدیم روایات کو ہر طرح قائم رکھا ہے۔ جس کا ایک معمولی ثبوت ہندی پنتوں کا یہ جلسہ ہے جس میں ایک اردو کے ادیب کا ہندی کے ادیبوں کی طرف سے سواگت کیا جا رہا ہے۔ ایسا میل جول شمالی ہندوستان اور خصوصاً اب اتر پردیش میں بہت مشکل ہو گیا ہے۔

آخر میں صدر جلسہ نواب مہدی نواز جنگ نے اپنی تقریر میں یاد دلایا کہ قاضی صاحب وہ شخص ہیں جنھوں نے حیدرآباد کی صحافت میں پہلی دفعہ قوم پرستی کی آواز بلند کی اور صحافت کا ایک بلند معیار قائم کیا۔ وہی تھے جنھوں نے یہاں کی صحافت کا درجہ بلند کیا اور پہلی دفعہ میدان میں آ کر رجعت پسندوں کی تحریکوں کا مقابلہ کیا۔ قاضی صاحب کی گل پوشی کے بعد جلسہ ختم ہوا۔　　　(نامہ نگار)

حیدرآباد کے مدیران جرائد کی طرف سے

قاضی عبدالغفار صاحب کا خیر مقدم

قاضی صاحب کی تقریر

حیدرآباد، ۵ جولائی۔ حیدرآباد اسٹیٹ نیوز پیپر ایڈیٹرس کانفرنس کی جانب سے آج شام ہندوستان کے مشہور ادیب اور صحیفہ نگار قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر پیام کے اعزاز میں اسپوٹ ہوٹل میں ایک پارٹی دی گئی جس میں حیدرآباد کے اکثر صحیفہ نگار شریک ہوئے۔

قاضی صاحب نے اس اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جب میں نے جب حیدرآباد سے پیام کا اشروع کیا تھا تو اس وقت یہاں صحافت کی آزادی تقریباً مفقود تھی اور بات بات پر کوتوال شہر کی جانب سے مدیران جرائد کے ساتھ نہایت غیر جمہوری اور اہانت آمیز رویہ اختیار کیا جاتا تھا بالآخر حیدرآباد کے اخبار نویسوں نے ان ناخوشگوار حالات کو ختم کرنے کی جد و جہد میں کامیابی حاصل کی۔

انھوں نے بتایا کہ اس زمانے میں جب حیدرآباد کے جریدہ نگار مختلف سیاسی نقاط نظر کے حامل تھے اور ایک دوسرے سے شدید اختلافات رکھتے تھے۔ پیشہ صحافت کے مفادات کے تحفظ کے تعلق سے ایک متحدہ پلیٹ فارم بنانے میں کامیاب ہوئے اور صحافتی برادری کا یہی اتحاد تھا جس نے حیدرآباد میں صحافت کو طاقتور بنایا تھا۔ قاضی صاحب موصوف نے کہا کہ آج بھی حیدرآباد کے اخبار نویسوں کو اپنے پیشے کے وقار اور صحافت کے مفاد کی حفاظت کے لئے متحد ہو کر قدم آگے بڑھانا چاہئے۔

قاضی عبدالغفار صاحب نے حیدرآباد کی صحافت کے دور ماضی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس دور کی صحافت کا سب سے نمایاں وصف یہ تھا کہ عام طور پر صحافتی تنقید کے لب و لہجہ میں سنجیدگی اور شائستگی کا عنصر غالب رہتا تھا۔ اس کے برعکس آج جبکہ ہم ایک جمہوری دور میں داخل ہوئے ہیں۔ مجھے اس بات کا قلق ہوتا ہے کہ حیدرآباد کی اردو صحافت کے بعض گوشوں میں لب و لہجہ کی شائستگی باقی نہیں رہی جس کی وجہ سے ہم جو بات کہنا چاہتے ہیں۔ اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

قاضی صاحب نے حیدرآباد کے اخبار نویسوں سے عام طور پر اور اردو صحیفہ نگاروں سے بطور خاص اس بات کی اپیل کی کہ وہ ملک کے بہتر مستقبل کی تعمیر اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے صحافت کی زبردست طاقت کو مؤثر بنانے کے لئے سنسنی خیز سرخیوں اور غیر شائستہ لب و لہجہ سے احتراز کرتے ہوئے ملک کے اہم مسائل اور عوام کے جذبات کی سچی ترجمانی اور ایک صحت مند مستقبل کی تعمیر کے لئے اپنی قوتوں کو صرف کریں۔

قاضی صاحب نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے یہ بھی کہا کہ حکومت کے اوپر بھی یہ ذمہ داری آتی ہے کہ وہ حیدرآباد کی صحافت خصوصاً اردو صحافت کی غیر مشروط امداد کرے اور اس کے فروغ و نشو و نما میں ہاتھ بٹائے اور اس لئے کہ یہاں ہماری صحافت ابھی تک ایک ابتدائی دور سے گزر رہی ہے اور اس کے استحکام و ترقی کے لئے حکومت کی توجہ اور دلچسپی بہت ضروری ہے۔

شری واسدیو راؤ صدر کانفرنس نے اپنی تقریر میں کہا کہ سنجیدگی ایک اخبار کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ میری تمنا ہے کہ حیدرآباد کی اخبار نویس سنجیدگی کا دامن نہ چھوڑیں۔

ابتدا میں مسٹر ظفر حسن معتمد ایڈیٹرس کانفرنس نے کانفرنس کی جانب سے قاضی صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس زمانے کے حالات پر روشنی ڈالی جبکہ قاضی صاحب نے حیدرآباد سے پیام جاری کیا تھا اور بتایا کہ حیدرآباد کی اردو صحافت میں پیام نے ایک نئے تاریخی دور کا آغاز کیا جس کے بہت دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ قاضی صاحب نے اردو صحافت میں ایک ایسے انداز بیان اور لب و لہجہ کا آغاز کیا جس نے صحافت کی سرحدوں کو ادب کی سرحدوں سے ملا دیا اور اس میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ اثر کی تربیت بھی پیدا کر دی۔ قاضی صاحب کے اس خاص رنگ سے متاثر ہو کر حیدرآباد میں نوجوان اخبار نویسوں کا ایک ایسا نیا قافلہ پیدا

ہوگیا جو آج بھی قاضی صاحب کی قائم کی ہوئی روایات کو اپنا کر آگے بڑھ رہا ہے۔

مسٹر اختر حسن نے یہ بھی کہا کہ حیدرآباد میں سب سے پہلے قاضی صاحب ہی نے تمام صحیفہ نگاروں کو تنظیم کے رشتے میں منسلک کیا اور انجمن صحافت اور انجمن مدیران جرائد کی طرح ڈالی، انھوں نے کہا کہ حیدرآباد کی صحافتی برادری کو متحد کرنے کے لئے قاضی صاحب نے جو تاریخی قدم اٹھایا تھا اس کے مفید اور دیرپا اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور توقع ظاہر کی کہ حیدرآباد کے صحیفہ نگار اڈیٹرس کانفرنس اور ورکنگ جرنلسٹوں کی تنظیموں میں زیادہ سے زیادہ شریک ہو کر ان صحافتی اداروں کو اور زیادہ مضبوط اور مستحکم بنائیں گے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد یہ تقریب اختتام کو پہنچی۔ آخر میں قاضی صاحب کے ساتھ تمام اخبار نویسوں کا جو اس محفل میں شریک تھا ایک گروپ فوٹو بھی لیا گیا۔

اخبار نویسوں کے علاوہ مسٹر شو ریو راؤ ناظم اطلاعات عامہ اور مسٹر جانکی پرشاد نائب ناظم اطلاعات عامہ نے بھی اس تقریب میں شرکت فرمائی۔

(نامہ نگار)

انجمن کی خبریں

خورجہ قمر تبریز صاحب جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو خورجہ لکھتے ہیں کہ انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کی دعوت پر حضرت خیر بہروی مددگار جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) خورجہ تشریف لائے اور یہاں کے میونسپل کمشنر صاحبان سے ملاقات کی اور میونسپل بورڈ کے اسکولوں میں اردو پڑھنے والے طلبا کے داخلے سے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کیں۔ آپ کی تشریف آوری کی اطلاع پاکر ملیح شہر کی انجمن ترقی اردو کے صدر جناب زیدی صاحب اور سکریٹری خضر برنی صاحب بھی خورجہ تشریف لائے اور مختلف مسائل زیر بحث پر تبادلہ خیال کیا۔

مجلس عاملہ کے اراکین کو مخاطب کرتے ہوئے خیر صاحب نے فرمایا کہ جمعیتہ کا موجودہ نصاب مکمل نصاب ہے۔ اس کو گھر گھر پہنچانے کی مہم شروع کرنی چاہئے۔ جمعیتہ نے یہ نصاب مرتب کر کے وقت کے اہم تقاضے کو پورا کیا ہے۔ اس نصاب کی خوبی یہ ہے کہ بچے بیک وقت اردو اور عربی زبان سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ نے مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب کے متعلق فرمایا کہ تقسیم کے بعد سے مجاہد ملت نے قوم و ملت کی بہت سی ایسی خدمتیں انجام دی ہیں جس پر ہماری نسلیں فخر کریں گی اور جب اس دور کی تاریخ لکھی جائے گی تو دنیا کو حیرت ہوگی کہ ایک آدمی نے اتنے بڑے بڑے اہم کام نامناسب حالات میں کس طرح انجام دئے۔

مجلس عاملہ کے ایک ممبر کے اس سوال پر کہ صدر جمہوریہ نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے وفد کا کیا جواب دیا۔

آپ نے فرمایا کہ کوئی قوم آئین کی پابندی کرنے کے بعد مایوس نہیں ہوتی۔ مرکزی انجمن ترقی اردو نے آئین سے ہٹ کر کوئی کام نہیں کیا۔ اس لئے ہم مایوس نہیں ہیں۔ [illegible] فیصلہ اردو کے حق میں ہوگا۔ آج جو کچھ تبدیلی نظر آرہی ہے اور [illegible] رفتہ رفتہ [illegible] اور اشارہ [illegible] یہ [illegible] ہوگی [illegible] کیا جاتا ہے [illegible] اس ملک کے [illegible]

مجلس عاملہ نے [illegible] کی موجودگی [illegible] ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے ایک نائب صدر، ایک جوائنٹ سکریٹری اور [illegible] کا اضافہ کیا [illegible] خاں صاحب، جوائنٹ سکریٹری [illegible] منتخب ہوئے۔

میونسپل بورڈ کے اسکولوں میں اردو پڑھنے والے طلبا کی [illegible] اردو زبان [illegible] تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے درخواست کے فارم [illegible] صاحب [illegible] انجمن ترقی اردو خورجہ سے [illegible] اسکولوں میں بچوں کو داخل کرانے کا کام [illegible] اردو کے حامی کو اس کام کے لئے وقت نکالنے کی ضرورت ہے۔

بستی قاضی محمد عدیل عباسی صاحب [illegible] انجمن ترقی اردو بستی اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"[illegible] ان [illegible] اسکولوں میں [illegible] کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ [illegible] طلبا [illegible] اس سال [illegible] ضلع میں [illegible] ان کی تعداد [illegible] کام کیا ہے [illegible] البتہ جو جدید نصاب تعلیم [illegible] کا شائع ہوا ہے اس کی وجہ [illegible] انگریزی [illegible] محنت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اگر نصاب تعلیم میں تبدیلی نہ ہوئی اور انگریزی [illegible] اردو کا گلا گھونٹ دیا گیا [illegible] اسکولوں سے اردو خارج ہو جائے گی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ [illegible] سال تک اردو اور انگریزی دونوں کی اجازت تھی [illegible] نصاب میں تبدیلی کر دی گئی۔ اس تبدیلی کی وجہ سے طلبا اور اساتذہ پریشان ہیں۔ مرکزی انجمن کو اس اہم کام کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ جلد سے جلد نصاب تعلیم تبدیل ہو سکے۔"

اردو کی خبریں

ویلور ۸ جولائی کو بمقام شادی محل زیر صدارت حضرت کمالی ویلوری ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ ذیل کے شعرائے کرام نے شرکت کی۔

حضرت ضیا فتح آبادی، حضرت شاکر نائطی، حضرت آسی تاپاتوری، حضرت مقبول آمبوری، حضرت شاداں میلوشاری، حضرت نقوی ویلوری، پروفیسر حیدر علی خاں حیدر مدراسی، پروفیسر محبوب پاشا محبوب، بزمی آمبوری، نیر رباتی، اسمٰعیل اختر ویلوری، مسعود حشرت ویلوری، حافظ راسے چوٹی، محمود اختر کاکانی۔ ان کے علاوہ بدر جمالی ویلوری، حضرت مائل القادری، حضرت نقوی باقوی، کاتب ویلوری، مظہر ویلوری، پروفیسر جلال کڑپوی، پروفیسر تشنہ، مولانا ابوالبیان حماد، ابوالضیا عزیز بنگلوری، حامد الانصاری، جمیل دانش اعظمی، عاقل عمری، راجی صدیقی، ہاشم ضیا مدراسی، آغا اوسطی، کاوش بدری اور عظیم آمبوری شریک بزم رہے۔

مشاعرہ کے سلسلے میں ساہوکار آر عبدالغفار صاحب، ڈی ایم عبدالرشید صاحب، حاجی ڈی سیٹھ عبدالرحیم صاحب، مہاراجہ بیڑی عبدالرحیم صاحب، ایس پی ضیاءالدین صاحب، کے یم ضیاءالدین صاحب، ایم عبدالصمد صاحب، پی ایم عطاءالحسن فرزند، یم عبدالرحمٰن طالب علم گورنمنٹ مسلم ہائی اسکول ویلور جناب سید عبدالسلام صاحب نے نہایت فراخدلی سے امداد فرمائی۔ (نامہ نگار)

علی گڑھ ۱۸ جولائی محمد عامر صاحب سکریٹری شعبہ ادبیات، این۔ آر۔ سی کلب (یو۔ پی۔) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لکھتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبا کا نیا تعلیمی سال شروع ہو گیا ہے اور این۔ آر۔ سی کلب (یو۔ پی۔) میں زندگی اپنی پوری چہل پہل کے ساتھ لوٹ آئی ہے اور محمد حامد صاحب وارڈن کلب ہذا نے سارے شعبوں میں دلچسپی بھی شروع کر دی ہے۔ اس سال کے لئے کلب کے حسب ذیل عہدے دار منتخب ہوئے ہیں۔

سکریٹری کامن روم	زین العابدین عابدی صاحب
لٹریری مکل	محمد عامر صاحب
سکریٹری پریزنٹیشن	گلدیش نرائن ماتھر صاحب
کیپٹن والی بال	رام کشن صاحب
سکریٹری بیڈمنٹن	سید حیدر عباس زیدی صاحب

(نامہ نگار)

الہ آباد انجمن اساتذہ الہ آباد نے اپنی ایک قرارداد کے ذریعے حکومت یوپی کو توجہ دلائی ہے کہ اردو تعلیم کے سلسلے میں واضح ہدایات جاری کی جائیں مثلاً:

(۱) جاری شدہ سرکلر تمام تعلیمی اداروں کو بھیجا جائے تاکہ منتظمین ان کی کا عذر کر کے اردو خواں طلبا کی درخواستوں کو رد نہ کر سکیں جیسا کہ یوپی میں بیشتر مقامات میں ہو رہا ہے۔

(۲) پرائمری اسکولوں میں اردو تعلیم کا کسی کلاس میں دس بچے یا پورے اسکول میں چالیس بچوں کا انتظام لازمی طور پر کیا جائے۔

(۳) منتظمین اردو داں معلمین کا تبادلہ کر کے اردو خواں طلبا کے لئے مشکلات پیدا کر رہے ہیں اس کو فوراً روکا جائے۔

(۴) اردو کورس کی کتابیں بازار سے غائب ہیں اس کا فوراً انتظام کیا جائے۔

(۵) جونیر ہائی اسکول یا ہائر سکنڈری اسکول میں ایک حکومت کی عام پالیسی یہی ظاہر کی جا رہی تھی کہ کسی کلاس میں پانچ بچے ہوں تو اردو تعلیم کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔ چونکہ ایسے اسکولوں میں مناسب تعداد کے باوجود اردو تعلیم کے انتظام سے انکار کیا جا رہا ہے اور اردو کے معلمین کا بھی تبادلہ کیا جا رہا ہے۔ اس کا فوری تدارک کیا جائے۔ (نامہ نگار)

ناگپور نگر کانگریس کمیٹی کے زیر اہتمام مدھیہ پردیش صوبہ کانگریس کمیٹی کے دفتر میں ایک میٹنگ منعقد ہوئی۔ کانگریسی حضرات کے علاوہ جمعیۃ علماء کے اراکین نے بھی خصوصی بلاوے پر شرکت فرمائی۔ اس میٹنگ میں ناگپور کارپوریشن کے اردو پرائمری اسکولوں کے مسئلے پر غور کیا گیا۔

شری تیاب ور صاحب نے اپنی ایک مختصر تقریر میں کانگریس پارٹی کے رویہ کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ ہماری کوششوں کے باوجود امید کے خلاف کارپوریشن نے اردو کے مسئلے میں ایک نامناسب تجویز پاس کی ہے انھوں نے فرمایا کہ مجھے اس کی وجوہات پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اتفاق سے ایسا ہو گیا ہے۔ کارپوریشن کے اس فیصلے سے مسلمانوں میں جو بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس بارے میں کانگریس پارٹی کی جو کہ کارپوریشن میں برسر اقتدار ہے، پوزیشن صاف کر دیں اور ہم نے یہ میٹنگ اسی غرض کے لئے منعقد کی ہے انھوں نے کہا کہ ہم کسی فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور نہیں کر رہے ہیں بلکہ اسے ایک خالص لسانی مسئلہ سمجھ کر اس پر غور کر رہے ہیں۔

عباس علی کمال صاحب نے کہا کہ ناگپور کارپوریشن کی کانگریسی پارٹی نے اردو کے مسئلہ میں صرف اتنی فیصدی ایمانداری کا ثبوت دیا کہ جو ممبران لیے تھے جنھوں نے غداری کی اور کانگریس کے وقار کو ٹھیس لگائی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اسکولوں کے بند کرنے کی تجویز پاس ہو گئی۔

جناب غلام دستگیر خاں صاحب نے فرمایا کہ چند مخصوص حضرات کے ذریعہ اگر آپ عام مسلمانوں کی بے چینی کو دور کرنا چاہتے ہیں تو یہ ناممکن ہے اس لئے کہ اردو یا مرہٹی کی جو جماعتیں توڑ دی گئی ہیں اور تقریباً ایک ہزار بچوں کی تعلیم برباد ہو رہی ہے۔ وہ بجائے خود کانگریس کے خلاف ایک خاموش پروپیگنڈہ ہے۔ اس لئے کہ اس میں کانگریس کے وقار کا سوال ہے۔ لہٰذا کانگریس اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس مسئلہ کو فوراً حل کرے تاکہ جن لوگوں کو اس سے تکلیف پہنچی ہے وہ مطمئن ہو جائیں۔ (نامہ نگار)

پرنٹر پبلشر قاضی عبدالغفار نے نیشنل پرنٹرس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا۔